بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

جماعتِ اسلامی کے سامنے اس وقت متعدد تعمیری کام ایسے ہیں جن کی ضرورت اور اہمیت ایک مدت سے محسوس کی جا رہی ہے مگر آج تک صرف اس وجہ سے ان کو عمل میں لانے کے لیے کوئی موثر قدم نہیں اُٹھایا جاسکا کہ ان کے لیے ذرائع بہم نہ پہنچ سکے محض مقدس خواہشات کا اظہار ہمارے نزدیک ایک فضول حرکت ہے اور لمبی چوڑی خوشنما اسکیمیں پیش کر کے لوگوں کو مرعوب کرنا ریاکاری کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے ان صفحات میں کبھی ان کاموں کا ذکر نہ کیا گیا۔ ہم اس بات کے منتظر رہے کہ خود جماعت ہی کے وسائل میں اللہ تعالیٰ کچھ گنجائش پیدا کر دے تو چھوٹے پیمانے ہی پر سہی، ان کو کسی نہ کسی طرح شروع کر دیا جائے۔ لیکن مدتِ انتظار طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے اور ایسے آثار دور دور کہیں نظر نہیں آتے کہ جماعت کے اپنے وسائل ان اہم تعمیری کاموں کے متحمل ہو سکیں گے۔ دوسری طرف روز بروز ان کی ضرورت زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی ہے اور ان میں سے کسی کو بھی بے فکری کے ساتھ ٹالنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا آج صرف اس لیے ان کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر ہماری قوم میں کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو اخلاص کے ساتھ اپنے وسائل و ذرائع بھلائی کے کاموں پر صرف کرنے کے لیے تیار ہوں تو وہ آگے بڑھیں اور ان کاموں میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔

ان میں سے اولین کام ایسی درس گاہوں کا قیام ہے جن میں محض نصابِ تعلیم پڑھا دینے

پر اکتفا نہ کیا جائے۔ بلکہ طلبہ کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے اور اُن میں وہ سیرت و صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو ایک ترقی پذیر اسلامی معاشرے اور ریاست کے کارکنوں اور کارفرماؤں میں ہونی چاہیے۔ یہ بات اب کس کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارے پرائمری اسکولوں سے لے کر کالجوں تک کہیں بھی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مگر نہ انسان ہی بنانے کی کوئی کوشش کی جاتی ہے اور نہ مسلمان۔ نسل بہ نسل ہمارے ہاں خودرو درختوں کی طرح اُگ رہی ہے۔ ہمارا کوئی نیشنل کیریکٹر گویا سرے سے ہے ہی نہیں جسے ہم اپنی نئی نسلوں میں پیدا کرنے کی باقاعدہ سعی کریں۔ ہر ہر فرد جیسا کچھ بن سکتا ہے۔ بس خود ہی بن جاتا ہے، یا اتفاقات کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ تربیت کے عنصر سے ہمارے مدرسوں اور کالجوں کی تعلیم خالی ہے، بلکہ درحقیقت ایجاباً ان میں اخلاق و سیرت کا معیار روز بروز تشویشناک حد تک گرتا جا رہا ہے۔ اس حالت میں جب تک پورے ملک کا نظامِ تعلیم درست نہیں ہوتا، کم سے کم ضروری تدبیر یہ ہے کہ مختلف مقامات پر ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جو اس کمی کو کچھ نہ کچھ پورا کرتی رہیں۔

اس سلسلے میں ہمارے پیشِ نظر یہ ہے کہ کام کی ابتدا پرائمری اسکولوں سے کی جائے اور پھر ان کو بتدریج ترقی دے کر ہائی اسکولوں کے درجے تک پہنچایا جائے۔ ان مدارس میں نصابِ تعلیم وہی ہو جو محکمۂ تعلیم نے مقرر کیا ہے مگر اس پر دینی اور اخلاقی تعلیم کے عنصر کا ہم اپنی طرف سے اضافہ کریں۔ اور مزید برآں یہ کوشش بھی کریں کہ تعلیم کے جدید ترین طریقوں سے فائدہ اُٹھا کر طلبہ کی علمی و ذہنی استعداد کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ اس تعلیمی پہلو کے ساتھ ساتھ طلبہ کی تربیت پر پوری توجہ صرف کی جائے تاکہ ایک طرف ان کے اندر بنیادی انسانی اخلاقیات کا صحیح طریقہ سے نشوونما ہو اور دوسری طرف وہ فکر، جذبات اور کردار کے لحاظ سے سچے مسلمان بنیں۔ اور ان خوبیوں کے ساتھ ہر طالب علم کارگاہِ حیات میں اُس منصب کو سنبھالنے کے لیے

تیار کیا جائے جس کی فطری صلاحیت اس میں پائی جاتی ہو۔

اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جماعت اسلامی کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے مدرسے محض فیسوں کے بل پر نہیں چل سکتے۔ اور اگر ان کے چلانے کا انحصار محض فیسوں پر ہو تو صرف خوشحال طبقے کے بچے ہی ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ غریب اور متوسط طبقے کے بچوں کو ان میں داخل ہونے کا موقع کسی طرح نہ مل سکے گا۔ اس لیے لامحالہ ایسے مدارس قائم کرنے اور چلانے کے لیے اتنی کافی مالی امداد ہمیں حاصل ہونی چاہیئے جس سے اس قسم کے بلند معیار مدرسوں کی ضروریات بھی فراہم کی جا سکیں اور ایسے ذہین بچوں کو بھی لیا جا سکے جو فیس ادا کرنے کے قابل نہ ہوں، یا پوری فیس نہ دے سکیں۔

دوسرا اہم کام ایسے محققین کی تیاری کا ہے جو علوم دینی اور علوم دنیوی میں بصیرت رکھتے ہوں اور پھر اسلامی نقطۂ نظر سے مختلف علمی شعبوں میں تحقیق اور تدوینِ جدید کا کام کر سکیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کو ایک مدت دراز سے بشدت محسوس کیا جا رہا ہے، مگر اسے پورا کرنے کے لیے آج تک برائے نام بھی کوئی کوشش نہیں ہوئی ہے۔ محققین کی پیداوار اوّل تو ہمارے ہاں ہے ہی بہت کم اور جو تھوڑی بہت پیداوار ہو بھی رہی ہے تو وہ ہماری یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے جہاں علمی تربیت کا مقصد مغربی یونیورسٹیوں کے مقصد سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ ان میں مشرقی علوم کے شعبے ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر وہ "مستشرق" پیدا کرنے کے لیے ہیں، محققینِ اسلام پیدا کرنے کے لیے ہرگز نہیں ہیں۔ پھر دوسرے علوم کی تحقیقات کے لیے جو تربیت ان میں دی جاتی ہے، اس میں اسلامی نقطۂ نظر قریب قریب ناپید ہے اور اس تربیت سے ایسے آدمی تیار ہو کر نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے جو تاریخ فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور اسی طرح کے دوسرے علوم کو قرآن کی روشنی میں نئے سرے سے مرتب کر سکیں یا کسی اہم مسئلے کی تحقیق قرآن کی رہنمائی میں کر سکیں۔ اس طرح کے محقق باقاعدہ تیار کرنے کا آج ہمارے ہاں کوئی انتظام موجود نہیں ہے۔ اس کام کو

ہماری قوم نے بالکل اتفاقات کے حوالے کر دیا ہے۔ بالکل اتفاقاتِ زمانہ سے کوئی شخص خود بخود اس قابلیت کا پیدا ہو جائے تو وہ تھوڑا بہت کام کرلے گا۔ ورنہ آئے دن طرح طرح کے "عطائی" اُلٹی سیدھی تحقیقات کر کے اسلام کی بیخ کنی کرتے رہیں گے۔ حالانکہ اگر فی الواقع ہم کو یہاں ایک اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم میں ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہو جو پہلے تحقیق و اجتہاد کے لیے ضروری استعداد بہم پہنچائیں، اور پھر اُن بے شمار مختلف خدمات کو بخوبی انجام دے سکیں جن کی ضرورت خالص اسلامی بنیادوں پر ایک نئی ریاست کی عمارت اٹھانے میں قدم قدم پر پیش آئے گی۔

اس کام کے لیے صرف ایسے نوجوان ہی مفید ہو سکتے ہیں جنہوں نے موجودہ درس گاہوں میں اپنی تعلیم مکمل کر لی ہو، یا کم از کم اتنی استعداد بہم پہنچا لی ہو کہ آگے تحقیقی مطالعہ کر سکیں۔ ایسے لوگوں کو کم از کم تین سال تک عربی زبان اور علومِ دینی کی تعلیم دینی ضروری ہو گی۔ اس کے بعد ان کو مختلف علمی شعبوں میں تحقیق کے کام پر لگایا جا سکے گا۔

جماعت اسلامی اس سے پہلے کئی مرتبہ اس کام کو شروع کرنے کا ارادہ کر چکی ہے، مگر اس میں متعدد مشکلات حائل ہیں جن کی وجہ سے ہر بار اسے ملتوی کرنا پڑا ہے۔ اول تو ایسے نوجوان ہی ہماری قوم میں بہت کم ہیں جو پِتّا مار کر اس طرح کے خاموش تعمیری کاموں میں اپنی محنت اور ذہانت صرف کرنے پر آمادہ ہوں۔ پھر جو تھوڑے بہت ایسے آدمی نکل آتے ہیں ان پر ان کے دوست، احباب، اقارب اور سب سے بڑھ کر ان کے والدین سخت دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ اس "فضول" کام میں پڑنے کے بجائے کچھ کمانے کی فکر میں لگیں۔ اس مرحلے سے بھی جو لوگ کامیابی کے ساتھ گزر جائیں ان کے سامنے فوراً یہ سوال آجاتا ہے کہ ان کی ضروریات کی کفالت کیسے ہو۔ ان کے سرپرست کبھی اس پر آمادہ نہیں ہوتے کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک وہ اس طرح کی تربیت کے لیے انہیں سہارا دیتے رہیں۔ اب اگر یہ لوگ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی معاشی کام کریں تو

ان کے وقت محنت اور توجہ کا بڑا حصہ اسی میں لگ جاتا ہے، حالانکہ ہمارے مقصد کے لیے ان کا ہمہ تن علمی کام میں منہمک رہنا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر ہم کوئی ادارۂ تربیتِ علمیہ قائم کرنا چاہیں تو اس کے لیے صرف ایک عمدہ کتب خانہ اور صرف اچھے معلمین کی فراہمی ہی کافی نہیں ہے، بلکہ یہ بھی ناگزیر ہے کہ جو نوجوان اس میں داخل ہوں ان کی کفالت کا بار بھی ادارہ ہی اُٹھائے۔ اور بعد میں ادارے ہی کے پاس ایسے ذرائع بھی ہوں کہ وہ انہیں علمی تحقیق کے مختلف کاموں پر لگائے اور ان کے نتائج تحقیق شائع کرے۔

تیسرا اہم کام تراجم کا ہے جس کی ضرورت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

ہماری چند مطبوعات کے ترجمے جب سے عربی زبان میں شائع ہوئے ہیں، عرب ممالک سے سخت تقاضا ہو رہا ہے کہ تمام کتابیں جلدی سے جلدی عربی میں منتقل کر دی جائیں، اور نئی کتابوں کے ترجمے بر وقت انہیں بہم پہنچا دیے جائیں۔ ان کی مانگ کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اخوان المسلمون کے دار الاشاعت نے ہماری جو کتابیں مصر میں شائع کی ہیں وہ ایک سال کے اندر پانچ پانچ سات سات ہزار کی تعداد میں نکل چکی ہیں۔ مگر ہمارے پاس عربی میں ترجمہ کرنے والوں کی اس قدر کمی ہے کہ ہم ان کی طلب کو کسی طرح پورا نہیں کر سکتے۔

دوسری طرف اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ عربی زبان سے اردو میں کتابیں منتقل کرنے کا کام کیا جائے۔ عربی زبان علوم اسلامیہ کے بہترین لٹریچر سے پہلے ہی مالا مال تھی۔ اس پر اب مزید اضافہ موجودہ زمانے کے مصنفین کی کتابوں سے ہو رہا ہے۔ لیکن ہماری زبان اس دولت سے بڑی حد تک محروم ہے۔ اگر ہم اردو زبان میں اس سرمائے کو منتقل نہ کریں تو آخر اسلام اور اس کی تاریخ اور اس کے قوانین اور نظام حیات کے متعلق ہماری قوم کا معیار معلومات اس قدر بلند کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے عام لوگ اپنی زندگی کے معاملات میں صحیح رائیں قائم کر سکیں اور گمراہیوں کا شکار ہونے سے بچ سکیں۔

اسی طرح انگریزی زبان میں بھی اسلامی لٹریچر کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ صرف ہمارے ملک کے انگریزی خواں لوگ اس کے طالب ہیں، بلکہ غیر مسلموں کی طرف سے بھی وقتاً فوقتاً یہ مطالبہ ہوتا رہتا ہے کہ ہمیں اسلام کے متعلق انگریزی میں صحیح معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ مگر ہمارے پاس ان کی پیاس بجھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ انگریزی میں بہت ہی کم کتابیں ایسی پائی جاتی ہیں جنہیں اطمینان کے ساتھ یہ کہہ کر کسی کے ہاتھ میں دیا جا سکے کہ یہ اسلام کی صحیح ترجمانی کر سکیں گی۔ اور ان میں ایسی کتابیں تو اور بھی کم ہیں جو جدید مسائلِ حیات سے اسلام کی روشنی میں بحث کرتی ہوں۔ اردو زبان میں اس مطلب کے لیے کافی ذخیرہ موجود ہے۔ مگر اس کو عمدہ زبان میں انگریزی کا جامہ پہنانا اور پھر ایسی شان کے ساتھ شائع کرنا کہ وہ انگریزی مطبوعات کے پہلو میں رکھا جا سکے، بہرحال کافی وسائل چاہتا ہے۔

بنگلہ زبان میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت بھی اس وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ پاکستان کی نصف سے زیادہ آبادی بنگالی بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ اور بنگالی زبان کا حال یہ ہے کہ اس میں اسلام کے متعلق معلومات کا سرمایہ بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُردو اور بنگالی کا قضیہ اگر اردو کے حق میں طے ہو بھی جائے۔ تو عام بنگالیوں کو اس حد تک اردو سے واقف ہوتے ہوتے کافی دیر لگے گی کہ وہ اردو مطبوعات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس دوران میں بنگال کے عوام کی جہالت و ناواقفیت جیسی کچھ پاکستان کے لیے نقصان رساں ہو سکتی ہے اس کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس پر مزید یہ ہے کہ وہاں بہت کم لوگوں کو بنگالی زبان کی اس کمزوری کا احساس ہے اور اس وقت تک بھی کوئی قابلِ ذکر کوشش اس کی تلافی کے لیے نہیں کی گئی ہے اب اگر ہم پاکستان کی نصف سے زیادہ مسلم آبادی کو مغربی بنگال کے زہریلے اثرات سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں جلدی سے جلدی بڑے پیمانے پر اس زبان میں اسلامی لٹریچر منتقل کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔

جماعتِ اسلامی نے اس غرض کے لیے ڈھاکہ میں ایک بنگلہ دارالاشاعت قائم کر دیا ہے مگر ذرائع کی کمی اس کی راہ بھی روکے ہوئے ہے۔

اس کے علاوہ کچھ اور مفید کام ہیں جو محض وسائل کی کمی کے سبب سے نہیں کیے جا سکتے، حالانکہ ان کا فائدہ اُس مال سے بہت زیادہ قیمتی ہے جو اُن پر صرف ہوگا۔

مثلاً، عربی زبان میں جب سے ہمارا لٹریچر شائع ہونا شروع ہوا ہے، بیرونی ممالک سے وقتاً فوقتاً ہمارے پاس ایسے لوگوں کی درخواستیں آتی رہتی ہیں جو مرکزِ جماعتِ اسلامی میں رہ کر اسلام کا تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے لیے اس میں صرف یہی ایک لالچ نہیں ہے کہ اس طرح ہم ممالکِ اسلامیہ کے ذہین نوجوانوں کو خدمتِ دین کے لیے تیار کر سکیں گے، بلکہ یہ بھی ہے کہ یہاں رہ کر وہ اردو زبان سیکھ لیں گے اور پھر اردو کی مفید چیزوں کو اپنی زبان میں منتقل کر سکیں گے۔ لیکن نہ ہماری غیرت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ انہیں اپنے خرچ پر یہاں آنے اور رہنے کے لیے کہیں، اور نہ ہمارے وسائل اسے برداشت کرتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو وظائف دے کر یہاں بلا سکیں۔

اسی طرح اب یہ ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہے کہ ہر سال حج کے موقع پر اہلِ علم و فکر کا ایک وفد حجاز بھیجا جائے۔ حج سے پہلے اور بعد کچھ مدت تک وہاں ٹھیرے۔ مختلف ممالک سے جو صاحبِ علم و معرفت لوگ وہاں آتے ہیں ان سے ملے۔ ہر طرح کی مفید معلومات کا ان سے تبادلہ کرے، اور ان کو بھی اس امر پر آمادہ کرے کہ ان کے ہاں کی ذمہ دار جماعتوں کے وفود حج کے موقع پر آیا کریں، تاکہ حج کی برکت کے ساتھ رفتہ رفتہ ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کا بھی فائدہ حاصل ہو، اور مسلمان قومیں ذہن و عمل کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی جائیں۔ اب تک یہ بات بالکل اتفاقات کے حوالے رہی ہے کہ کہیں سے کوئی ذی علم آدمی استطاعت بہم پہنچنے پر حج کے لیے چلا جائے اور دوسرے مقامات سے اسی طرح اتفاقاً آجانے والے لوگوں سے مل لے۔ اس سے کوئی بڑا مفید نتیجہ مترتب نہیں ہوتا۔ اب یہ کام ایک سوچے سمجھے

منصوبے کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ایسے وفود اگر ہر سال جمع ہونے لگیں تو دنیا بھر کی مسلمان قومیں ایک دوسرے کے اصلی حالات سے بروقت باخبر ہوتی رہیں گی، ہر ملک کے مفید کاموں کا فائدہ سب کو پہنچ سکے گا اور باہمی تعاون کی بہت سی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔

یہ جتنے کام بھی ہم نے بیان کیے ہیں، ہر شخص اعتراف کریگا کہ ان میں سے ہر ایک تعمیرِ ملت کے لیے مفید اور ضروری ہے۔ ان میں سے کسی کا تعلق بھی ایسے مسائل و معاملات سے نہیں ہے جن میں ہمارے درمیان اختلافات ہیں۔ اور ہم سے اختلاف رکھنے والے بھی بالعموم یہ جانتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے پاس ایسے اہل اور امین آدمیوں کی کمی نہیں ہے جو ان ساری تجویزوں کو بخوبی عمل میں لاسکتے ہیں۔ کمی ہے تو ایسے اللہ کے بندوں کی ہے جو اپنی دولت کو اپنی تعمیرِ ذات ہی کے لیے وقف رکھنے کے قائل نہ ہوں بلکہ اخلاص کے ساتھ اس کا کچھ حصہ اپنی ملت کی تعمیر کے لیے بھی صرف کرسکتے ہوں۔

ہم اپنے وقت اور محنت کا کوئی حصہ چندے مانگتے پھرنے پر صرف نہیں کرسکتے، اور نہ یہ کبھی ہمارا طریقہ رہا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے کارکن زیادہ سے زیادہ جو کچھ کرسکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اپنے حلقۂ تعارف میں ایسے لوگوں تک یہ تجویزیں پہنچادیں جو ان کے علم میں دولتِ زر کے ساتھ جذبۂ خیر کی دولت بھی رکھتے ہوں۔ اس کے بعد اگر ہمیں کوئی مدد پہنچی، تو جس حد تک بھی وہ پہنچے گی، ہم ان کاموں کو، یا ان میں سے کسی کام کو شروع کردینگے۔ ورنہ جس طرح اب تک یہ تجویزیں تمناؤں کے قبرستان میں دفن رہی ہیں، آئندہ بھی رہیں گی۔

اس سلسلہ میں ہم یہ کہہ دینا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ جو اصحاب ان تعمیری کاموں کے لیے ہمیں کوئی وقتی یا مستقل مدد دینا چاہیں، وہ اگر کسی ایک مخصوص کام کا تعین نہ کریں تو بہتر ہے۔ کیونکہ جو رقمیں اس طرح کے تعین کے ساتھ آئیں گی انہیں ہم کو لامحالہ الگ الگ مدات میں جمع کرنا پڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ مجموعی طور پر تو وہ سب کسی ایک کام کو شروع کردینے کے لیے

کافی ہوں، مگر جدا جدا ہر مد میں اتنی کم رقم جمع ہو کہ اس سے کوئی کام بھی شروع نہ کیا جا سکے

جب سے اس ملک میں اسلامی نظام حکومت کے قیام کا مطالبہ شروع ہوا ہے، اس کے خلاف اہلِ زیغ و ضلالت کی طرف سے طرح طرح کی فتنہ انگیزیوں اور بہانہ سازیوں کا سلسلہ جاری ہے، اور خود حکومت نے بھی ہزاروں روپے ماہوار کے خرچ پر بہت سے بندگانِ شکم کی خدمات اس غرض کے لیے حاصل کر رکھی ہیں کہ لوگوں کے ذہن کو اسلام کے بارے میں جتنا پراگندہ کر سکتے ہیں، کر ڈالیں۔ من جملہ اُن فتنوں کے جو یہ لوگ اُٹھا رہے ہیں، ایک یہ سوال بھی ہے کہ صاحب، یہ تو ٹھیک ہے کہ جب یہ مملکت اسلام کے نام پر قائم ہوئی ہے تو یہاں اسلامی شریعت ہی کو نافذ ہونا چاہیے، اور ظاہر ہے کہ جب ہم مسلمان ہیں تو ہمارا قانون آخر شریعت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، مگر یہ تو بتائیے کہ یہاں کونسی شریعت نافذ ہو گی؟ مسلمانوں میں تو بہت سے مذاہب (یعنی مدارسِ فکر) پائے جاتے ہیں۔ کوئی حدیث و فقہ کو چھوڑ کر صرف قرآن پر انحصار کرنا چاہتا ہے۔ کوئی قرآن کے ساتھ صرف حدیث کو لیتا ہے۔ کوئی فقہ کا بھی قائل ہے۔ مگر فقہ میں بھی کوئی ایک مذہب نہیں ہے۔ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی، بہت سے مذاہب موجود ہیں۔ پھر متعدد گروہ مسلمانوں میں ایسے بھی ہیں جو اسلام کے صرف موٹے موٹے اصول لے کر ان پر معاشرے اور ریاست کا نظام چلانا چاہتے ہیں اور جزئیات میں قرآن و حدیث کے ہر حکم کی لفظ بلفظ پیروی کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ ایسے احکام کی پیروی کو غلط سمجھتے ہیں جو عہدِ حاضر کی روح کے خلاف ہوں۔ اب فرمائیے کہ ان بہت سی "شریعتوں" میں سے کس کو نافذ کیا جائے؟ اور دوسرے لوگ جو اس شریعت کو صحیح نہ سمجھتے ہوں، انہیں اس کے قبول کرنے پر کیسے مجبور کیا جائے؟

عام مسلمان جن میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہیں، اس سوال کو سن کر پریشان ہو جاتے ہیں اور اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ شریعت کا نفاذ تو برحق، مگر اس پیچیدگی کا آخر

کیا حل ہے؟

ہمارے پاس اس کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔

الزامی جواب یہ ہے کہ آپ کی تقریر کے دو حصے بالکل ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ اپنی گفتگو کی ابتدا آپ چند ایسے فقروں سے کرتے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہاں شریعت ہی کو ملک کے دستور و قانون کی حیثیت سے نافذ ہونا چاہیے۔ اور اس کا خاتمہ آپ چند ایسے سوالات پر کرتے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت بہرحال یہاں نافذ نہیں ہو سکتی۔ سوال یہ ہے کہ اس تضاد کو آپ کیسے رفع کرینگے؟ اگر آپ اپنی گفتگو کے پہلے حصے میں مخلص ہیں تو آپ کو خود ہی یہ بتانا چاہیئے۔ کہ جس شریعت کو آپ یہاں نافذ کرنا اس قدر ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ان بہت سی شریعتوں میں سے کونسی شریعت ہوگی۔ اور اُس پیچیدگی کا آپ کے نزدیک کیا حل ہے جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے۔ اور اگر آپ اپنی گفتگو کے آخری حصے میں ایماندار ہیں تو اپنے ابتدائی فقروں کو بدلیے اور صاف صاف ایک راستباز آدمی کی طرح کہہ ڈالیے کہ شریعت کو یہاں نافذ نہ ہونا چاہیے۔ ورنہ آپ کی گفتگو کے ان دونوں حصوں کو جوڑ کر ایک معقول آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ یا تو آپ ایک ناممکن چیز کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ آپ کے خلل دماغی کی دلیل ہے۔ یا پھر آپ کا اصل مقصد شریعت کے نفاذ کو ناممکن ثابت کرنا ہے مگر ابتدائی فقروں میں اس کے نفاذ کی تائید آپ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ کسی کو آپ کے مسلمان ہونے میں شک نہ رہے۔ اور یہ آپ کے منافق ہونے کی دلیل ہے۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ مدارس فکر یا مذاہب کا پیدا ہونا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ جہاں کسی نے دو چار مضمون لکھ دیے اور دس پانچ آدمیوں نے پڑھ کر ان کی تائید کر دی، ایک مدرسۂ فکر یا مذہب بن گیا۔ کاغذ کی دنیا میں ایسے مدرسے اور مذاہب چاہے کتنے ہی وجود میں آجائیں، مگر جب ایک جمہوری نظام کے دستور و قانون کی تشکیل کا سوال درپیش ہو تو قابل لحاظ

صرف وہ مذاہب ہوا کرتے ہیں جن کے پیچھے پیروؤں کی کوئی بڑی تعداد موجود ہو۔ آپ جن بہت سے مذاہب کا ذکر فرما رہے ہیں، ان میں سے اکثر کے پیروؤں کی تعداد کا جائزہ لیا جائے تو شاید ایک فی لاکھ بھی نہ نکلے گی۔ بلکہ بعض تو ایک فی کروڑ سے زیادہ پیرو اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ ان چند آدمیوں کو آخر یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ یا تو ہماری "شریعت" ملک میں نافذ ہو ورنہ کوئی "شریعت بھی" نافذ نہ ہو؟

جمہوری نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پاکستان میں مسلمانوں کے صرف تین ہی مذاہب قابلِ لحاظ ہیں۔ ایک حنفی۔ دوسرے اہلِ حدیث۔ تیسرے شیعہ

حنفیوں میں دیوبندی، بریلوی وغیرہ جو مختلف گروہ پائے جاتے ہیں ان کے اختلافات دراصل کلامی اختلافات ہیں جن کا ریاست کے دستور و قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ ریاست کے قیام اور انتظام سے اگر کسی چیز کا تعلق ہے تو وہ صرف دستوری اور قانونی مسائل ہیں، اور ان مسائل میں تمام حنفی متفق ہیں، خواہ کلامی مسائل میں ان کے درمیان کیسے ہی شدید اختلافات ہوں۔

اہلِ حدیث حنفیوں سے صرف قانون (یعنی فقہ) میں اختلاف رکھتے ہیں۔ دستوری مسائل میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

البتہ شیعہ دستور اور قانون، دونوں میں اپنا ایک الگ مذہب رکھتے ہیں جس کے اصول اور فروع بہت سے مسائل میں مذاہبِ اہلِ سنت سے مختلف ہیں۔

لیکن ان تین مذاہب کی موجودگی بھی کوئی لاینحل پیچیدگی نہیں پیدا کرتی۔ اگر شریعت کو ملک کا دستور اور قانون بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا) تو جمہوریت کے مسلّم قاعدے کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور قانون کی شکل اختیار کرے گی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے، اور اگر ان کے ساتھ

اہلِ حدیث کو بھی شمار کیا جائے تو مجموعی تعداد ۹۰ فی صدی سے بھی زیادہ نکلے گی۔ اس صورت میں لامحالہ دستور تو شریعت کی اُس تعبیر کے مطابق ہی بنے گا جس پر حنفی اور اہلِ حدیث متفق ہیں۔ اور لازماً ملکی قانون حنفی تعبیرِ شریعت پر مبنی ہوگا۔ رہے قلیل التعداد گروہ، تو ان کے چار حق پوری فراخ دلی کے ساتھ تسلیم کیے جائیں گے۔

اوّل یہ کہ ان کے شخصی معاملات پر اُن کے اپنے مذہب کی فقہ ہی نافذ ہوگی۔

دوم یہ کہ قانونِ ملکی کے حدود میں رہتے ہوئے وہ اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے اور اپنے مذہبی شعائر کا اظہار کرنے میں آزاد ہونگے۔

سوم یہ کہ ان کے بچوں کو ان کے مذہب کی تعلیم دینے کا اطمینان بخش انتظام ہوگا۔

چہارم یہ کہ حدودِ قانون میں رہتے ہوئے وہ اپنے خیالات و نظریات کی اشاعت آزادی کے ساتھ کر سکیں گے۔

انہی امور پر جنوری ۱۹۵۱ء میں ۳۱ علماء کی اُس مجلس نے اتفاق کیا تھا جو کراچی میں منعقد ہوئی تھی اور جس میں حنفی، اہلِ حدیث اور شیعہ فرقوں کے معتمد علیہ علماء شریک تھے۔ لہٰذا جو لوگ مذہبی اختلافات کی پیچیدگی کو اپنی شطرنج کا ایک مہرہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کو یہ سُن کر خواہ کتنا ہی صدمہ ہو، ہم ایک امرِ واقعہ کے طور پر انہیں یہ خبر سناتے ہیں کہ الحمدللہ، یہ پیچیدگی پہلے ہی رفع ہو چکی ہے۔ وہ اس پر ماتم کرنا چاہیں تو ضرور کریں مگر انشاء اللہ، وہ اس مہرے کو استعمال کر کے بازی نہ جیت سکیں گے۔

پاکستان و ہندوستان کی تشکیل سے پہلے جب انگریز یہاں حکومت کرتے تھے، اس وقت باشندگانِ ملک حکمراں گروہ کے لیے اجنبی تھے اور حکمراں گروہ باشندگانِ ملک سے بیگانہ تھا۔ ان کے لیے ایک دوسرے کے نفسیات اور جذبات و احساسات کو سمجھنا مشکل تھا۔ حکمراں، عام باشندوں سے الگ اپنی کوٹھیوں اور کلبوں کی دنیا میں رہتے تھے۔ ان کے

پاس ملک کے حالات کو جاننے کا کوئی ذریعہ سی آئی ڈی کی رپورٹوں اور پاونیر اور اسٹیٹسمین جیسے اخباروں کے سوا نہ تھا۔ ان دونوں ذرائع سے گزر کر باشندوں کے احساسات کو سمجھنے کے لیے اگر کوئی پیمانہ ان کے پاس تھا تو صرف یہ کہ کونسا مسئلہ ایسا ہے جس پر ملک میں عام ایجی ٹیشن برپا ہوتا ہے، جلسے اور جلوس اور ہنگامے رونما ہوتے ہیں، لاٹھی چارج اور فائرنگ کی نوبت آتی ہے۔ اس طرح صرف ایک عام ہیجان ہی سے انہیں اس بات کا ثبوت ملتا تھا کہ فلاں مطالبے کے پیچھے عوام کی بہت بڑی تعداد ہے اور اسی بنیاد پر، نہ کہ مطالبے کے نفسِ مضمون اور اس کی صحت و معقولیت کی بنیاد پر، وہ اسے وزن دیا کرتے تھے۔

پاکستان قائم ہونے کے بعد جب حکومت کا انتظام ہماری اپنی قوم کے افراد کو سونپا گیا۔ تو ہمیں بجا طور پر یہ توقع تھی کہ ان حکمرانوں کی روش سابق حکمرانوں کی روش سے مختلف ہوگی۔ وہ اپنی قوم کے جذبات و احساسات کو براہ راست خود سمجھیں گے اور محسوس کریں گے۔ اس کے مطالبات کو ایجی ٹیشن کے پیمانے سے نہیں بلکہ ان کی اپنی عقلی، علمی اور نفسیاتی بنیادوں کے لحاظ سے پرکھیں گے۔ جو بات صحیح ہوگی اسے خود مانیں گے خواہ اس کی پشت پر کوئی ایجی ٹیشن ہو یا نہ ہو۔ اور اپنی قوم کے مزاج کے خلاف کوئی چیز طاقت کے بل پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں گے۔ مگر بڑے درد کے ساتھ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آج ہمارے اپنے بھائی بھی حکومت کی کرسیوں پر بیٹھ کر وہی روش اختیار کر رہے ہیں جو کل اجنبی حکمرانوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ وہی عام باشندوں سے الگ تھلگ رہنا، وہی سی آئی ڈی کی رپورٹوں اور "ڈان" اور "سول" جیسے اخباروں پر معلومات کا انحصار، وہی مطالبات کو ان کی ذاتی قدر کے بجائے ایجی ٹیشن کے پیمانوں سے ناپنا، اور وہی قوم کے خلافِ مزاج چیزوں کو اس کے حلق سے زبردستی اتروانے کی کوششیں۔ ان حرکات میں سے کسی میں بھی کل کی بہ نسبت آج کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ فرق اگر ہے تو بس یہ کہ اجنبی حکمرانوں کے لیے یہ روش فطری تھی اور قومی حکمرانوں کے لیے بالکل غیر فطری۔ باہر والے مجبوراً ایسے تھے، مگر گھر والوں نے

سراسر مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ایسا بنا لیا ہے۔

اس کی افسوسناک مثالیں آئے دن سامنے آتی رہتی ہیں اور اسی کی ایک تازہ مثال وہ طرزِ عمل ہے جو قادیانیوں کے معاملے میں ہمارے حکمرانوں سے ظہور میں آرہا ہے۔ کراچی اور پنجاب میں حکومت نے جو رویہ اس معاملے میں اختیار کیا ہے، اور اب حکمران گروہ جس نظر سے اس پورے قضیے کو دیکھ رہا ہے، اس سے ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو قادیانیت اور قادیانیوں کے بارے میں نہ تو مسلمانوں کے عام جذبات کا کوئی علم ہے اور نہ یہ اُن گہرے بنیادی اسباب سے کوئی واقفیت رکھتے ہیں جو ان جذبات کی تہ میں کارفرما ہیں۔ انہوں نے بالکل اجنبی حکمرانوں کی طرح محض سطح پر چند چیزیں دیکھ کر سارے معاملے کے متعلق کچھ قیاسات قائم کیے ہیں اور سراسر غلط اندازوں پر ایسی کارروائیاں کر رہے ہیں جن سے سخت اندیشہ ہے کہ معاملہ سلجھنے کے بجائے اور زیادہ بگڑتا چلا جائے گا۔

اولین چیز، جس سے کسی مسلمان کو ناواقف نہ ہونا چاہیے تھا، یہ ہے کہ قادیانیت ایک ایسے مسئلے میں مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے متصادم ہوتی ہے جو قرآن، حدیث، اور پوری امت کے تیرہ سو سال کے اجماع سے ثابت ہے اور جس کے معاملے میں مسلمانوں نے اپنی پچھلی تاریخ میں آج تک کسی انحراف کو برداشت نہیں کیا ہے۔ قرنِ اول سے تمام مسلمان آج تک اس بات پر متفق رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، ان پر سلسلۂ نبوت ختم ہو چکا ہے، اور ان کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اپنے درمیان کسی نئی نبوت کے دعوے کو کبھی نہیں چلنے دیا، اور جہاں کہیں اس فتنے نے سر اٹھایا، سارے مسلمانوں نے بالاتفاق اس کا سر کچل دیا۔ مگر ہندوستان میں مسلمان پچاس برس تک اس کڑوے گھونٹ کو صرف اس

مجبوری سے نگلتے رہے کہ یہاں ایک غیر مسلم حکومت ان پر مسلط تھی جس کا آئین کسی نئی نبوت کے دعوے میں مانع نہ تھا۔

اس بات سے بھی کوئی مسلمان ناواقف نہیں ہو سکتا کہ ایک دعوائے نبوت پیش ہو جانے کے بعد یہ ممکن نہیں رہتا کہ اس کے بارے میں غیر جانبداری یا تغافل کی روش اختیار کی جا سکے۔ اس کے بعد تو ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا اسے مانیے یا جھوٹا قرار دیجیے۔ جو اس کو مانے وہ لامحالہ تکذیب کرنے والوں کے نزدیک کافر ہوگا، کیونکہ جھوٹے نبی کو نبی ماننا کفر ہے۔ اور جو اس کو نہ مانے وہ بلا ریب ماننے والوں کے نزدیک کافر ہوگا، کیونکہ سچے نبی کو جھوٹا کہنا کفر ہے۔ اس لیے قادیانیت نے نہ صرف یہ کہ ایک ایسا مسئلہ مسلمانوں کے درمیان پیدا کر دیا جسے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا، بلکہ اس مسئلے نے عملاً ماننے اور نہ ماننے والوں کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی جس کے ہوتے یہ دونوں گروہ کسی طرح بھی ایک امت میں جمع نہ ہو سکتے تھے۔ مزید برآں، جبکہ قرآن، حدیث اور اجماع امت کی بنا پر عام مسلمانوں کے نزدیک باب نبوت قطعی بند تھا، تو یہ بات بالکل ناگزیر تھی کہ ایک گروہ قلیل کے سوا مسلمانوں کا سواد اعظم اس کو جھٹلا دے، اور اس طرح سواد اعظم اس گروہ قلیل کے نزدیک کافر ہو اور وہ گروہ قلیل سواد اعظم کے نزدیک کافر ٹھہرے۔

یہ کڑوا گھونٹ مسلمان ہرگز حلق سے نہ اتارتے اگر اختیارات اُن کے ہاتھ میں ہوتے۔ لیکن اختیارات ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں تھے جس کو مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے، یا ان کی قومی سالمیت سے کوئی دلچسپی کیا معنی، ہمدردی تک نہ تھی۔ اس لیے ایک امت کے اندر دوسری امت بنتی بھی رہی اور پھر اُسی امت میں شامل بھی رہی جس سے کاٹ کاٹ کر وہ افراد کو اپنے ساتھ ملا رہی تھی۔ انگریز کے لیے وہ سب لوگ یکساں تھے جن کے نام مسلمانوں کے طریق تسمیہ پر رکھے جاتے ہوں۔ ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے لحاظ سے اب یہ نو خیز امت، امت مسلمہ میں شامل رہ سکتی ہے یا نہیں۔ وہ برابر اسی بات پر مصر رہے کہ دونوں کو ایک ہی امت شمار کیا جائے گا، اور مسلمانوں

ہیں یہ طاقت نہ تھی کہ ان کے جابر آقا جس عنصر کو زبردستی ان کی امت میں ٹھونس رہے ہیں اس کو اپنے سے الگ کر سکیں۔ اس صورتِ حال سے ایک دینی مسئلے کے علاوہ طرح طرح کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسئلے بھی پیدا ہوتے چلے گئے جن کی تلخی چالیس پینتالیس سال میں بڑھتے بڑھتے مسلمانوں کے لیے ایک مستقل دردِ سر بن گئی۔

قادیانیوں اور عام مسلمانوں کو نئی نبوت کی جس چھری نے ایک دوسرے سے کاٹا تھا، وہ سینکڑوں اور ہزاروں خاندانوں کو اس طرح کاٹتی چلی گئی کہ بھائی بھائی سے، باپ بیٹے سے، شوہر بیوی سے کٹ کر الگ ہو گئے اور ان کے درمیان توارث، مناکحت، معاشرتی میل جول، حتیٰ کہ ایک دوسرے کے جنازوں کی شرکت تک کے تعلقات منقطع ہونے لگے۔

پھر چونکہ قادیانیوں کی نئی امت مسلمانوں کے درمیان ان کی عام نفرت، مزاحمت اور مخالفت کے ماحول میں بن رہی تھی، اس لیے انہوں نے اپنے حالات کے قدرتی تقاضوں سے اپنی مضبوط جتھہ بندی شروع کر دی جس کی بنیاد قادیانی اور غیر قادیانی کی تمیز، اور مسلمانوں کے مقابلے میں قادیانیوں کی باہمی معاونت پر قائم تھی۔ انہوں نے ملازمتوں میں ایک دوسرے کی مدد سے گھسنا اور عام مسلمانوں پر اپنے آدمیوں کو ترجیح دینا اور مل جل کر اپنے آدمیوں کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ انہوں نے جہاں کہیں بھی انہیں کچھ سرکاری اثرات حاصل ہوتے، مسلمانوں کو دبانا اور اپنے گروہ کی طاقت کو مضبوط کرنا شروع کیا۔ انہوں نے زمینداری میں، تجارت میں، صنعت و حرفت میں، ہر جگہ مسلمانوں کے خلاف جتھہ بندی کر لی۔ اس طرح ان کے اور مسلمانوں کے درمیان منافرت کے وہی تمام اسباب پیدا ہوتے چلے گئے جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت کو بڑھا کر آخر کار اتنا تلخ کر دیا کہ تقسیم ملک تک نوبت پہنچ گئی۔

یہ صورت حال کسی ایک جگہ یا ایک حصۂ آبادی تک محدود نہ تھی، بلکہ وسیع پیمانے پر سارے ملک میں موجود تھی، ہزارہا خاندان اس سے متاثر تھے، اور لاکھوں آدمیوں کو اس کی تلخیوں میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ملا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات آئے اگر وہ عام مسلمانوں سے الگ تھلگ اور اسلامی عقائد سے بے پروا اور اپنی قوم کے احساسات سے ناآشنا نہ ہوتے تو وہ اس مسئلے کو اُن مسائل کی فہرست میں رکھتے جنہیں اولین فرصت میں حل کرنا چاہیے تھا۔ کم از کم وہ اس کی تلخیوں اور پیچیدگیوں کو اور زیادہ تو نہ بڑھاتے لیکن بدقسمتی سے وہ بالکل اپنے انگریز پیش روؤں کے جانشین بن کر رہے اور انہوں نے نہ صرف سابق حالت کو برقرار رکھا بلکہ ان اسباب میں اور زیادہ اضافہ کرنا شروع کر دیا جو مسلمانوں کو پہلے ہی قادیانیوں کے خلاف کافی غضب ناک کر چکے تھے۔

انہوں نے پاکستان میں "ربوہ" کے نام سے ایک دوسرا قادیان بنوا دیا اور قادیانیوں کو وہاں وہ سہولتیں فراہم کر دیں جو مسلمانوں کی کسی جماعت اور کسی ادارے کو فراہم نہیں کی گئیں۔ آج اس ربوہ سے جھنگ، لائل پور، گوجرانوالہ اور سرگودھا کے ملحقہ علاقے اس قدر تنگ ہیں کہ گویا ایک خنجر ان کے سینے میں پیوست کیا گیا ہے۔ وہاں وہ تمام حالات رفتہ رفتہ پیدا ہوتے جا رہے ہیں جو کبھی قادیان میں تھے، اور ہم نے اس علاقے کے مسلمانوں میں وہی احساسات پائے ہیں جو فلسطین میں وطنِ یہود کی بنیاد پڑتے وقت ملحقہ عرب آبادی میں پائے جاتے تھے۔

انہوں نے فوج میں اور سول محکموں میں قادیانیوں کو پہلے سے زیادہ ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز کیا اور پھر ان لوگوں نے پوری جتھہ بندی کے ساتھ مزید قادیانیوں کو ملازمتوں میں داخل کرنا اور عام مسلمانوں کو دھکیل دھکیل کر قادیانیوں کی ترقی کے لیے راستہ صاف کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے انتخابات میں بے تکلف اپنی پارٹی کے ٹکٹ قادیانیوں کو دیے جس کے صاف معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی نے جو ملک کی حکمراں بھی ہے، قادیانیوں کو نہ صرف مسلمان، بلکہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق دار تک تسلیم کر لیا۔

ان سب سے زیادہ سخت غلطی انہوں نے یہ کی کہ سر ظفر اللہ خاں کو وزارت خارجیہ کا ذمہ دارانہ

عہدہ سونپ دیا۔ یہ صاحب ملازمتوں میں قادیانیوں کو گھسانے اور اپنی سرکاری پوزیشن کو قادیانیت کی تبلیغ میں استعمال کرنے کے لیے پہلے ہی سخت بدنام تھے۔ اب اس پوزیشن پر آکر ان کی ذات قادیانیت کے فروغ کا ایک اہم ذریعہ بن گئی۔ اور اس پر مزید ایک فتنے کا اضافہ یوں ہوا کہ جب وزیر خارجۂ پاکستان ہونے کی حیثیت سے ان کو متعدد مسلمان ملکوں کی وکالت و حمایت کے مواقع ملے تو اس سے قادیانیوں نے پورا فائدہ اٹھا کر باہر کے مسلمان ملکوں میں بھی اپنی تبلیغ کا دائرہ وسیع کرنا شروع کر دیا۔ اس چیز کی وجہ سے وہ آگ جو قادیانیت کے خلاف پاکستان میں بھڑک رہی تھی، بیرون پاکستان بھی بھڑک اٹھی اور متعدد مسلمان ملکوں کی طرف سے یہ شکایات آنے لگیں کہ تمہاری حکومت کی یہ غلطی اب ہم پر بھی اس فتنے کو مسلط کر رہی ہے۔ مفتی مصر کا تازہ فتویٰ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد جب ہمارے حکمرانوں کے سامنے ان کی حماقتوں کے مجموعی نتائج ایک عام ہیجان کی شکل میں نمودار ہوگئے تو اب بھی وہ اس ہیجان کو اور اس کے حقیقی اسباب کو سمجھنے سے پہلوتہی کر رہے ہیں اور اس کے متعلق ایسے غلط اندازے کر رہے ہیں جو کسی ملک کے ذمہ دار حکمرانوں کے نہیں بلکہ نادان بچوں ہی کے شایان شان ہو سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی سطحی اُبال ہے جو عارضی طور پر محض احرار کے اُکسانے سے رونما ہو گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بس چند مقامات پر دفعہ ۱۴۴ لگا کر اور کچھ پکڑ دھکڑ اور لاٹھی چارج کر کے اور کچھ خطیبوں کو ڈرا دھمکا کر یہ جوش ٹھنڈا کیا جا سکے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کچھ ہوشیار لوگ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دے کر اس اتفاق رائے کو ختم کر سکیں گے جو قادیانیوں کے معاملے میں پایا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ یہ حضرات اس مسئلے کی تاریخ سے، اس کے دینی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی پہلوؤں سے اور عام مسلمانوں کے تلخ احساسات کی گہرائیوں سے بالکل ناواقف ہیں، اور ایسے حکمرانوں

کی طرح ان کی معلومات کا انحصار سراسر سی آئی ڈی کی رپورٹوں اور ڈان اور سول جیسے اخبارات کے کالموں پر ہے۔ ایسے لوگ اگر اسی سرمایۂ علم و فہم کے ساتھ اس ملک کا نظم و نسق چلاتے رہے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کب کس صدمۂ عظیم سے ہم کو دوچار ہونا پڑے گا۔

بلاشبہ کوئی معقول آدمی بھی یہ پسند نہ کریگا کہ اس مسئلے کو، یا کسی دوسرے اجتماعی مسئلے کو فساد انگیز طریقوں سے حل کیا جائے۔ ایسے طریقے اگر اختیار کیے جائیں تو یقیناً ہر حکومت کا فرض ہے کہ ان کو روکے، اور ہر امن پسند شہری کا فرض ہے کہ ان کو روکنے میں حکومت کی مدد کرے۔ مگر ایک جمہوری حکومت کے فرائض صرف پولیس ڈیوٹی تک محدود نہ ہونے چاہئیں۔ اس کا یہ فرض بھی تو ہے کہ اجتماعی زندگی میں اگر کوئی خرابی پائی جاتی ہو تو اسے اور اس کے اسباب کو سمجھے اور موجبِ فساد بننے سے پہلے اس کا علاج کرے۔ آخر یہ کس عقلمند حکومت کا کام ہو سکتا ہے کہ جو اسباب معاشرے میں نصف صدی سے ایک سخت پیچیدگی پیدا کر رہے ہیں، اور جن سے معاشرے کی بنیادوں میں ہر وقت ایک غیر محسوس اضطراب برپا رہتا ہے، اُن کو جوں کا توں قائم رہنے دیا جائے۔ اور صرف وقتاً فوقتاً ان کے پیدا کردہ اُبال کو اوپر سے لاٹھیاں برسا کر اور زبان بندیاں کر کے روکا جاتا رہے؟ اس تدبیر سے ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے فساد رُک جائے۔ مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے حقیقی اسباب اندر ہی اندر گھٹ کر ایک آتش فشاں پیدا کر دینگے جسے پھٹنے سے روک دینا کسی انسانی طاقت کے بس میں نہ ہوگا۔ ایک امت کے اندر دوسری امت کا وجود بہرحال ایک غیر فطری چیز ہے۔ جس طرح کسی انسان کے معدے میں مکھی کو زبردستی نہیں روکا جا سکتا، اسی طرح کوئی امت بھی اپنے اندر دوسری امت کے بننے اور بڑھنے کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ غیر فطری حالت بہرحال ختم کرنی ہی پڑے گی۔ اور جتنی جلدی یہ ختم ہو اتنا ہی پاکستان کے حق میں بہتر ہوگا۔

(باقی صفحہ ۱۵۴ پر)

(بقیہ اشارات)

جہاں تک حکومت اور اس کے نظم و نسق کو چلانے والے اصل ذمہ دار ادارے (یعنی مرکزی پارلیمنٹ اور دستور ساز اسمبلی) کا تعلق ہے، ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ اُسے ایک قومی حکومت اور قومی پارلیمنٹ بننے کی حیثیت سے اپنے فرض کو پہچاننا چاہیے اور اس مسئلے کو جلد سے جلدی حل کر کے اُس اضطراب کو ختم کر دینا چاہیے جو ملک میں حقیقی اسباب کی بنا پر پیدا ہوا ہے لیکن ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر وہ اپنا فرض نہ پہچانے تو مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟

اس سوال کا جواب ہمارے نزدیک وہی ہے جو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ اس سے پہلے دے چکی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہاں ایک قادیانی فتنہ ہی موجود نہیں ہے، بیشمار فتنے ہیں جو ایک صحیح اسلامی حکومت کے موجود نہ ہونے اور قوانین شرعیہ کے معطل رہنے کی وجہ سے پرورش پا رہے ہیں۔ اس حالت میں یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ ان ضمنی اور طفیلی فتنوں کے خلاف الگ الگ محاذ آئے دن قائم کیے جاتے رہیں اور اصل بنائے فساد کو جوں کا توں باقی رہنے دیا جائے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم جڑ کی اصلاح پر اپنی تمام کوششوں کو مرکوز کر دیں، یعنی ساری قوم اپنی متحدہ طاقت کے دباؤ سے یہاں ایک خالص اسلامی دستور بنوائے اور پھر اس دستور کے مطابق حکومت کا انتظام چلانے کے لیے صالح لوگوں کو منتخب کرے۔ اس کے بعد بیک وقت سارے ہی فتنوں کا سدباب ہو جائے گا جن میں سے ایک یہ قادیانی فتنہ بھی ہے۔ ورنہ ہمیں سخت اندیشہ ہے کہ اگر مختلف چھوٹے چھوٹے مسائل کو چھیڑ کر توجہات اور کوششوں کو منتشر کر دیا گیا تو نہ اصل مسئلہ ہی حل ہو سکے گا اور نہ اس کے شاخسانوں ہی میں سے کسی کی قطع و برید میں کامیابی نصیب ہو گی۔

اس سلسلے میں ہمیں ایک اور بات بھی اپنے برادرانِ دین سے کہنی ہے۔ وہ یہ کہ آپ خواہ کوئی تحریک کسی مقصد کے لیے بھی چلائیں، بہرحال اس کے چلانے میں نظم و ضبط کی سختی کے ساتھ پابندی کریں اور کبھی اشتعال میں آ کر بے قابو نہ ہوں۔ آگ کی حرارت تو بلاشبہ کسی نہ کسی درجے میں ضروری ہے، مگر آگ وہی کام کی ہے جو حد میں رہے اور حسبِ ضرورت بھڑکائی اور بجھائی جا سکے۔ ورنہ بے قابو آگ تو گھر ہی جلا سکتی ہے، کھانا نہیں پکا سکتی۔